

THE SYMBOLIC AND METAPHORICAL STYLE OF MODERN URDU SHORT STORY

DR FARZANA RIAZ

ASSISTANT PROFESSOR, URDU DEPARTMENT, GOVERNMENT COLLEGE UNIVERSITY LAHORE

DR. SHAZIA ANDLEEB

ASSISTANT PROFESSOR (URDU) INSTITUTE OF HUMANITIES AND ARTS, KHAWAJA FAREED
UNIVERSITY OF ENGINEERING AND INFORMATION TECHNOLOGY RAHIM YAR KHAN

DR. UZMA NOREEN

LECTURER, URDU DEPARTMENT, GOVERNMENT COLLEGE WOMEN UNIVERSITY SIALKOT

LIAQAT ALI

ISCHOLAR MS URDU INSTITUTE OF HUMANITIES AND ARTS, KHAWAJA FAREED UNIVERSITY OF
ENGINEERING AND INFORMATION TECHNOLOGY RAHIM YAR KHAN

SANIN ASIF

ISCHOLAR MS URDU INSTITUTE OF HUMANITIES AND ARTS, KHAWAJA FAREED UNIVERSITY OF
ENGINEERING AND INFORMATION TECHNOLOGY RAHIM YAR KHAN

*Corresponding Author: Dr. Shazia Andleeb

ABSTRACT

Modern Urdu Short story is significantly different from traditional fiction in terms of its themes, style of expression and artistic experiments. In the modern era, human life has become complex, fragmented and uncertain. Industrial development, scientific inventions, political conflicts, wars, migration, civilizational decline, social inequality and existential crisis have deeply affected the inner world of man. It was not possible to present these complex situations and events in a direct and simple narrative, so modern Urdu fiction writers made the symbolic and metaphorical style an effective means of expression. This style, instead of limiting the fiction to a mere sequence of events, gave it intellectual, philosophical and psychological depth.

The symbolic style refers to a style of expression in which a character, object, scene, event or environment is used in a broader and deeper sense, going beyond its apparent meaning. Similarly, in the metaphorical style, one reality is presented in the context of another reality so that beauty, meaning and breadth are created in the expression. Modern fiction writers have mastered both these styles so well that every character, every scene and every event in their fiction has an inner and symbolic meaning along with its outward appearance. This is why the study of modern fiction is not just a process of reading a story but also a journey to access its hidden meanings and layered understandings.

The main purpose of using symbols in modern Urdu Short story is to present themes such as human existence, inner anguish, loneliness, fear, meaninglessness, identity crisis, social chaos, cultural defeat and spiritual emptiness in a more effective way. Fiction writers often use objects such as deserted streets, deserted paths, darkness, closed doors, forest, birds, water, fire, fog, travel, ruins, mirrors and dreams as symbols. These symbols do not only reflect the external environment but also interpret the inner state of man, psychological conflict and collective consciousness. In this way, the reader is forced to find the hidden meaning behind each symbol, which adds to the intellectual depth of the story.

Mansha Yad, Anwar Sajjad, Khalida Hussain, Mirza Hamid Baig, Asad Muhammad Khan and other modern fiction writers used symbolic and metaphorical styles very successfully.

Keywords: Symbolic, Metaphorical Style, Intellectual, Philosophical, Psychological, Mansha Yad, Anwar Sajjad, Khalida Hussain, Mirza Hamid Baig, Asad Muhammad Khan.

جدید اردو افسانے کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا علامتی اور استعاراتی اسلوب ہے۔ جدید دور میں انسان کو جن سماجی، سیاسی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل کا سامنا ہوا ہے برا راست بیان کرنے کے بجائے افسانہ نگاروں نے علامتوں، استعاروں، تمثیلات اور اشاروں کے ذریعے پیش کرنا زیادہ مؤثر سمجھا۔ اس طرح افسانہ نگار نے نہ صرف افسانے کی فنی خوبصورتی میں اضافہ کیا بلکہ اس کے معنی اور مفہیم کو بھی زیادہ گہرائی اور وسعت عطا کی۔ جدید افسانہ نگاروں نے محسوس کیا کہ انسانی وجود کی پیچیدگی، داخلی کرب، تنہائی، شناخت کے بحران اور معاشرتی انتشار جیسے موضوعات کو محض سادہ بیانیے سے پوری طرح بیان نہیں کیا جاسکتا، اس لیے انہوں نے علامتی اور استعاراتی اسلوب کو افسانہ نگار کا مؤثر وسیلہ بنایا۔

علامت دراصل کسی ایسی شے، کردار، واقعے یا منظر کو کہتے ہیں جو اپنے ظاہری مفہوم کے ساتھ کسی گہرے، پوشیدہ یا وسیع تر مفہوم کی نمائندگی بھی کرے، جبکہ استعارہ ایک ایسی ادبی ترکیب ہے جس میں کسی شے کو دوسری شے کے روپ میں پیش کر کے معنی میں وسعت اور گہرائی پیدا کی جاتی ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے ان دونوں اسالیب کو استعمال کر کے انسانی وجود، تنہائی، بے معنویت، شناخت کے بحران، سماجی ناانصافی، سیاسی جبر اور تہذیبی زوال جیسے پیچیدہ موضوعات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ جدید افسانے میں علامتی اسلوب کی بدولت علم واقعت بھی غیر معمولی معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک ویران شہر، سناٹا راستہ، بند دروازہ، اندھیرا، جنگل، پرندہ، دریا یا سفر محض اشیاء یا مناظر نہیں رہتے بلکہ انسانی تنہائی، خوف، بے یقینی، آزادی، جستجو

یا داخلی کشمکش کی علامت بن جائے ہیں۔ اسی طرح استعارائی انداز بیان افسانے کو محض واقعاتی سطح تک محدود نہیں رہنے دیتا بلکہ اس کے اندر فکری اور فلسفیانہ جہش پیدا کرتا ہے۔
جدید ارنو افسانے کے نمایاں اور معتبر افسانہ نگاروں میں منشا باد کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے جدید افسانے کے فنی اور فکری ارتقا میں
نمایاں کردار ادا کیا۔ اگرچہ ان کا شمار علامتی افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے تاہم انہوں نے محض جدیدیت کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ ارنو افسانے کی کلاسیکی اور حقیقت پسندانہ روایت سے بھی اپنا مضبوط تعلق
برقرار رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں روایت اور جدت کا ایک خوبصورت امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ہاں نہ صرف موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے بلکہ اسلوبِ اظہار، فکری جہت، کردار نگاری اور فنی تکنیک میں بھی نمایاں وسعت نظر آتی ہے، جس نے انہیں اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں منفرد مقام عطا کیا۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز حقیقت پسندانہ افسانوں سے کیا، جن میں علم انسان کی زندگی، معاشرتی مسائل اور روزمرہ کے حالات کو براہِ راست اور سادہ انداز میں پیش کیا گیا۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ان کے فن میں مسلسل ارتقا پیدا ہوا اور انہوں نے مثالی علامتی اور تجریدی اسلوب کو بھی پوری فنی مہارت کے ساتھ اختیار کیا۔ ان کے افسانوں میں علامت اور استعارہ محض آرائی یا شایان کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانی وجود، معاشرتی حقیقتوں، ذہنی تغیرات اور نفسیاتی پیچیدگیوں

کو زیادہ گہرے اور مؤثر انداز میں بیان کرنے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ یہی فنی شعور ان کے افسانوں کو فکری اعتبار سے زیادہ بامعنی اور دیرپا بناتا ہے۔
منشا یاد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شہری اور دیہاتی دونوں زندگیوں کی نہایت حقیقت پسندانہ اور فنی انداز میں عکاسی کی ہے۔ چونکہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ دیہی ماحول میں گزارا، اس لیے دیہت کی ثقافت، رسم و رواج، فطری ماحول، انسانی تعلقات اور وہاں کے مسائل سے وہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ دوسری طرف شہری زندگی کی مصروفیات، مصنوعیت، تنہائی، معاشرتی تضادات اور بدلتے ہوئے انسانی رویوں کو بھی انہوں نے نہایت باریک بینی سے محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں دیہت کی سادگی اور شہر کی پیچیدگی دونوں ایک ساتھ جلوہ گر ہوئی ہیں۔ وہ ان دونوں فضاؤں کو اس مہارت سے پیش کرتے ہیں کہ ان کی تصویریں محض حقیقت نگاری تک محدود نہیں رہیں بلکہ علامتی اور استعاراتی معنویت اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کے ہاں دیہت صرف ایک جغرافیائی مقام نہیں بلکہ انسانی فطرت، معصومیت اور بے بسی کے افسانہ بن جاتا ہے، جبکہ شہر جدید انسان کی تنہائی، مادہ پرستی، بے چینی اور رشتوں کی شکست و ریخت کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔
ان کے پہلے افسانوی مجموعے "بند مٹھی میں جگنو" ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ علامتی اور استعاراتی اسلوب پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں حقیقت نگاری، علامت، تمثیل اور استعارے کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو ان کے فنی شعور اور تخلیقی بصیرت کا ثبوت ہے۔ ان کے افسانوں میں استعمال ہونے والی علامتیں استعارے انسانی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں، سماجی تضادات، داخلی کرب، امید، محرومی اور تنہائی زوال جیسے موضوعات کو نہایت گہرائی کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں علامتیں کبھی فطرت کے عناصر کی صورت میں سامنے آتی ہیں، کبھی کرداروں کے ذریعے اور کبھی عام روزمرہ کے واقعات کے اندر پوشیدہ معنویت اختیار کر لیتی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے بقول منشا یاد نے اردو افسانے میں روایت اور جدت کے درمیان ایک متوازن اور خوبصورت رشتہ قائم کیا ہے۔ انہوں نے علامتی اسلوب کو اس انداز سے برتا ہے کہ ان کی تخلیقات نہ تو حقیقت سے دور ہوئی ہیں اور نہ ہی تجرید کے باعث ناقابلِ فہم بن جاتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی سچائی، انسانی جذبات، معاشرتی مسائل اور تنہائی اقدار علامتوں اور استعاروں کے ذریعے اس مہارت سے پیش کیے گئے ہیں کہ قاری نہ صرف کہانی سے لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ اس کے پیرائے میں پوشیدہ فکری اور معنوی جہت پر بھی غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی خصوصیت منشا یاد کو جدید اردو افسانے کے اُن ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل کرتی ہیں جنہوں نے علامتی اور استعاراتی اسلوب کو فنی وقار، فکری گہرائی اور ادبی معنویت عطا کی۔ قاسمی صاحب کے بقول:

"بند مٹھی میں جگنو کو دو حصوں میں تقسیم کر کے منشا یاد نے اپنے اس نقطہ نظر کا اعلیٰ ثبوت فراہم کیا ہے۔ پہلے میں حقیقت نگاری اور براہِ راست کہانی کہنے کا جو طرزِ عمل ہے وہ دوسرے حصے کے علامتی افسانوں پر بھی اپنا پر تو ڈال رہا ہے اور یہی سبب ہے کہ منشا یاد کی علامتیں بالکل سامنے کی اور بہت واضح علامتیں ہیں"۔^۱

دراصل اس افسانے کا مرکزی کردار جدید عہد کے اس انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے مکر و فریب، مصنوعیت، خود غرضی، بے اعتمادی اور اخلاقی زوال سے شدید ذہنی اور روحانی اضطراب کا شکار ہے۔ وہ اس آلودہ اور پرآلودہ ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اسے فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے دھوکا، بے حسی، منافقت اور بے معنویت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی شخصیت شدید داخلی کشمکش اور وجودی بحران میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی مایوسی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے وجود اور اپنی حقیقت پر بھی شک کرنے لگتا ہے۔ اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ صرف جسمانی طور پر زندہ ہے، جبکہ اس کی روح، احساسات اور شناخت کہیں گم ہو چکے ہیں۔ اس کردار کی یہ کیفیت دراصل جدید انسان کے وجودی کرب، تنہائی، شناخت کے بحران اور زندگی کی بے معنویت کی نہایت مؤثر علامت بن جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کردار کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ جدید مادی اور مشینی معاشرے میں انسان نہ صرف دوسروں سے بلکہ اپنی ذات سے بھی دور ہوتا جا رہا ہے، پہل تک کہ اس کے لیے اپنی ہستی کی حقیقت بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس داخلی اضطراب اور وجودی بے یقینی کو افسانہ نگار نے نہایت فکارانہ انداز میں پیش کیا ہے، جس سے افسانے کی علامتی اور فکری گہرائی مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کی ترجمانی درج ذیل اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے:

"اکثر اسے شک ہوتا کہ وہ خواب نہیں تھا اور وہ واقعی مر چکی ہے۔ دو اکڑ خود کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھی رہتی کہ وہ ہے یا نہیں ہے"۔^۲

منشا یاد کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اظہارِ فن کے لیے مختلف اسالیب، فنی تکنیکوں اور بیانیہ طریقوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری، علامت نگاری، تمثیل، استعاراتی اندازِ بیان، تجرید اور نفسیاتی تجزیے جیسے متعدد فنی عناصر ایک ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ وہ اپنے موضوع اور مقصد کے مطابق اسلوب کا انتخاب کرتے ہیں، اسی لیے ان کی ہر تخلیق اپنے فنی مزاج اور معنوی جہت کے اعتبار سے الگ شناخت رکھتی ہے۔ ان کے ہاں اسلوب محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ افسانے کے فکری اور جمالیاتی حسن کو نمایاں کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ بھی ہے۔ مذکورہ افسانہ بھی جدید افسانوی تکنیک کے تحت تخلیق کیا گیا ہے، جس میں روایتی اندازِ بیان کے بجائے علامتی اور استعاراتی پیرایہ اظہار کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں واقعات سے زیادہ

انسانی باطن، نفسیاتی کیفیت اور وجودی احساسات کو اہمیت دی گئی ہے۔ منشا یاد نے کرداروں، مناظر اور مختلف علامتوں کے ذریعے انسان کی اس داخلی دنیا کو نمایاں کیا ہے جو ظاہری زندگی کے شور و ہنگامے میں اکثر نظر انداز ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک اصل زندگی وہ نہیں جو انسان باہر کی دنیا میں گزارتا ہے، بلکہ وہ ہے جو اس کے احساسات، خیالات، خوابوں، خواہشوں اور روحانی تجربات کی صورت میں اس کے اندر آباد ہوتی ہے۔ اس افسانے میں استعمال ہونے والی علامتیں محض ایسی آرائش نہیں بلکہ گہرے فکری اور نفسیاتی مفہیم کی حامل ہیں۔ یہ علامتیں انسان کی تنہائی، بے چینی، وجودی اضطراب، شناخت کے بحران، روحانی خلا اور سکون کی جستجو کو مؤثر انداز میں نمایاں کرتی ہیں۔ مرکزی کردار اپنی داخلی دنیا میں ایسے سکون، اطمینان اور معنویت کی تلاش میں سرگرداں ہے جو اسے جدید مادی اور مشینی معاشرے

میں کہیں میسر نہیں آتی۔ بظاہر وہ عام انسانوں کی طرح زندگی گزار رہا ہوتا ہے، لیکن اس کے باطن میں ایک مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے۔ یہی کشمکش علامتوں اور استعاروں کے ذریعے قاری کے سامنے اس انداز میں آتی ہے کہ افسانہ محض ایک واقعہ نہیں رہتا بلکہ جدید انسان کی پوری نفسیاتی اور روحانی کیفیت کا لہجہ بن جاتا ہے۔

منشا یاد کی فنی مہارت کا کمال یہ ہے کہ وہ جدید تکنیک کو اختیار کرتے ہوئے بھی افسانے کو پیچیدہ یا غیر فطری نہیں بناتے۔ ان کے علامتی اور استعاراتی انداز بیان میں فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ، روانی اور معنوی وسعت بھی موجود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے قاری کو صرف ایک کہانی سناتے کے بجائے اس کے باطن میں جھانکنے، اپنی ذات کو پہچاننے اور زندگی کے حقیقی سکون اور معنویت پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ افسانہ جدید اردو افسانے میں علامتی اور استعاراتی اسلوب کا ایک کامیاب اور مؤثر نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔

افسانہ "تماشا" منشا یاد کی فنی بصیرت، تخلیقی انفرادیت اور جدید افسانوی شعور کا ایک نہایت اہم نمونہ ہے۔ یہ افسانہ اپنے اسلوب، زبان و بیان، علامتی نظام، فنی ساخت اور بیانیہ تکنیک کے اعتبار سے جدید اردو افسانے میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ منشا یاد نے اس افسانے میں روایتی طرز بیان سے ہٹ کر ایسی فنی

تکنیک اختیار کی ہے جس کے ذریعے ایک عام سے منظر کو گہری فکری اور علامتی معنویت عطا کر دی گئی ہے۔ افسانے کی بنیاد بظاہر ایک میلے کی فضا پر استوار ہے، مگر مصنف اس میلے کو محض تفریح یا سماجی اجتماع کے طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ اسے انسانی زندگی، معاشرتی رویوں، خواہشات، غریب، بے ثباتی

اور وجودی کشمکش کی ایک وسیع علامت بنا دیتا ہے۔ اس افسانے میں میلے کے مختلف مناظر، کردار، آوازیں، رنگ، ہجوم اور سرگرمیاں کہانی کے بنیادی اجزا کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ یہ نمل عناصر بظاہر حقیقی معلوم ہوتے ہیں، لیکن جیسے جیسے افسانہ آگے بڑھتا ہے، ان کی ظاہری حیثیت ختم ہوتی جاتی ہے اور وہ ایک گہری علامتی اور نمٹیلی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یوں قاری محسوس کرتا ہے کہ میلہ دراصل پوری انسانی زندگی کا استعارہ ہے، جہاں ہر شخص کسی نہ کسی کردار میں مصروف ہے، ہر چہرہ ایک نقاب اوڑھے ہوئے ہے اور ہر سرگرمی کے پیچھے ایک

پوشیدہ حقیقت موجود ہے۔ افسانے کا اختتام خاص طور پر نمٹیلی رنگ اختیار کر لیتا ہے، جہاں نمل واقعہ محض ایک کہانی نہیں رہتے بلکہ انسانی زندگی، سماجی حقیقتوں اور وجودی مسائل کی نمائندگی کرنے لگتے ہیں۔ اگرچہ منشا یاد جدید افسانوی اسلوب، علامتی اظہار اور فنی تکنیکوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تہذیبی، ثقافتی اور انسانی روایت سے کبھی لاتعلق نہیں ہوتے۔ ان کے اندر ایک ایسا حساس اور بلوفاہر انسان زندہ ہے جو اپنی سرزمین، اپنی ثقافت، اپنی اقدار اور اپنی روایت سے گہری محبت اور عقیدت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں جدیدیت اور روایت کے درمیان کسی تصادم کے بجائے ایک خوبصورت ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ وہ جدید اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے بھی اپنی تہذیبی شناخت اور معاشرتی اقدار کو پوری

اہمیت دیتے ہیں، جن سے ان کا فن نہ صرف عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رہتا ہے بلکہ اپنی جڑوں سے بھی مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔

منشا یاد کے افسانے "راستے بند ہیں" کو اس حوالے سے ان کے فنی اور فکری رجحان کی بہترین مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے ایسے محروم، بے سہارا اور

پسے ہوئے انسانوں کی زندگی کو موضوع بنایا ہے جو معاشرتی ناانصافی، غریب، بے بسی اور بنیادی انسانی سولتوں سے محرومی کا شکار ہیں۔ ان کرداروں کی زندگی مسلسل جدوجہد، محرومی، مایوسی اور بے بسی کی تصویر بن کر سامنے آتی ہے۔ افسانہ اس حقیقت کو نہایت مؤثر انداز میں اجاگر کرتا ہے کہ معاشرے کے کچھ طبقات ترقی، خوشحالی اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، جبکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لیے زندگی کا ہر راستہ بند ہو چکا ہے۔ ان کے خواب، خواہشات اور امکانات سماجی ناانصافی اور طبقاتی تفریق کی دیواروں میں قید ہو کر رہ گئے

ہیں۔

اس افسانے میں منشا یاد نے نہایت سادہ مگر اثر انگیز زبان، حقیقت پسندانہ منظر نگاری اور گہری علامتی فضا کے ذریعے محروم طبقے کے دکھ، احساں، تپائی، بے بسی اور

زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کی تحریر قاری کو صرف ایک واقعے سے آگاہ نہیں کرتی بلکہ اسے معاشرے کے ان پوشیدہ پہلوؤں پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے جو عام طور پر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "تماشا" اور "راستے بند ہیں" دونوں افسانے منشا یاد کی فنی مہارت، علامتی و نمٹیلی اسلوب، روایت سے وابستگی اور انسانی مسائل سے گہری وابستگی کے بہترین مظہر تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کیفیت کو افسانے کے درج ذیل منظر سے بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

"اور کیا پسند کرو گے؟"

"میں نے آج تک سب نہیں چکھا"

میں اُسے پھولوں کی نوکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کرتے کہتا ہوں ۔

"اے سب میں تم جتنا چلو کیا سکتے ہو؟"

وہ ایک سبب نگاہوں سے اٹھتا ہے دانتوں سے کٹتا ہے اور کہتا ہے "اے تو ناٹھاتی ہے؟" یہ ناٹھاتی

ہیں تم اسے سب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ "وہ پھر دانتوں سے کٹتا ہے اور کہتا ہے "اے! یہ امرود ہے یہ امرود ہے یہ امرود ہے۔"

سیب ہے۔"

"مجھے کیا پتہ سب کا نالہ کیا ہوتا ہے میں نے کبھی کھایا ہی نہیں ؟"

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ منشا یاد جدید اردو افسانے کے اُن ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے

زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی بلکہ نہایتی معاشرے کے جذبات، احساسات، مسائل، ثقافتی اقدار اور انسانی رشتوں کی نزاکت کو بھی نہایت گہرائی اور فنی مہارت کے ساتھ اجاگر کیا۔ ان کے افسانے نہایت کے عام انسان کی زندگی، اس کے دکھ سکھ، محرومیوں، امیدوں، روایات اور تہذیبی شناخت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے قاری کو اس معاشرے سے روشناس کراتے ہیں جو جدید شہری زندگی کی چکاچوند سے دور ہونے کے باوجود انسانی اقدار، سماجی، خلوص اور تہذیبی ورثے سے مالا مال ہے۔ اسی لیے ان کے افسانے صرف تہذیبی زندگی کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ قاری کو اپنی جڑوں، اپنی تہذیب اور اپنی اجتماعی شناخت کی یاد بھی دلاتے ہیں۔

منشا یاد کے فن کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید افسانوی تکنیک اور علامتی اسلوب اختیار کرنے کے باوجود اپنی روایت سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔ ان کے ہاں روایت، ثقافت اور جدید فکری شعور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی تلخ حقیقتوں، سماجی تضادات، طبقاتی

نامبرائیوں، تہذیبی تبدیلیوں اور وجودی مسائل کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں فکری گہرائی بھی پیدا ہوتی ہے اور فنی حسن بھی برقرار رہتا ہے۔ ان کا مقصد محض علامتوں کا استعمال نہیں بلکہ علامتوں کے ذریعے زندگی کی حقیقی معنویت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ ان کے دیگر اہم افسانوں، مثلاً "جڑیں"، "کچی پکی قبریں"، "درخت آدمی" اور "پھول سے لپٹی ہوئی بیل" میں بھی یہی فنی اور اسلوبیاتی خصوصیات نمایاں طور پر دیکھی

جا سکتی ہیں۔ یہ تمام افسانے اپنے منفرد اسلوب، علامتی ساخت، گہرے فکری پس منظر اور مؤثر بیانیے کی وجہ سے اردو افسانے میں ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں استعمال ہونے والی علامتیں اور استعارے محض ادبی آرائش کا حصہ نہیں بلکہ انسانی وجود، معاشرتی حقیقتوں، تہذیبی زوال، داخلی کرب، محبت، محرومی، پادشاہت اور وقت کی تبدیلی جیسے موضوعات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تخلیق اپنے اندر ایک نئی معنی دنیا سونے ہوئے نظر آتی ہے۔ اسی طرح ان کا افسانہ "پانی میں گہرا ہوا پانی" بھی ان کے منفرد اسلوب اور فنی مہارت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس افسانے میں منشا یاد نے نہایت محتاط متوازن اور بامقصد انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ان کی زبان سادہ ہونے کے باوجود معنوی اعتبار سے نہایت گہری ہے، جبکہ استعاروں اور علامتوں کا استعمال اس قدر فطری اور برمحل ہے کہ وہ کہانی کا لازمی حصہ محسوس ہوتے ہیں۔ افسانے میں ہر استعارہ اپنے اندر متعدد معنوی پرتیں رکھتا ہے اور قاری کو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہی فنی توازن ان کے اسلوب کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز بناتا ہے۔

درحقیقت منشا یاد کے افسانوں کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے علامت اور استعارے کو اس انداز سے برتا ہے کہ ان کے افسانے نہ تو محض علامتی بن کر حقیقت سے دور ہوتے ہیں اور نہ ہی تجرید کی پہچانگی میں الجھ کر قاری سے اپنا تعلق کھو دیتے ہیں۔ ان کے ہل علامتیں زندگی کی حقیقی صورت حال سے جنم لیتی ہیں اور انسانی تجربیات کے ساتھ اس طرح مربوط ہوتی ہیں کہ قاری انہیں اسٹی سے محسوس کر لیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری، علامت، استعارہ، تمثیل، داستانوی انداز بیان اور جدید بیانیہ تکنیک ایک دوسرے کے ساتھ اس خوبصورتی سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ فن اور حقیقت میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ یہی ان کا انفرادی اور منفرد اسلوب ہے جس نے انہیں جدید اردو افسانے میں ایک ممتاز مقام عطا کیا۔ انہوں نے روایت اور جنت، حقیقت اور علامت، ذہنی زندگی اور جدید فکری شعور کو اس مہارت کے ساتھ یکجا کیا کہ ان کی تخلیقات اردو افسانے کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ ان کی تحریریں نہ صرف فنی اعتبار سے مضبوط ہیں بلکہ انسانی زندگی، معاشرتی افکار، تہذیبی شناخت اور وجودی مسائل کی گہری تقیم بھی فراہم کرتی ہیں۔ اسی بنا پر منشا یاد کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے علامت، استعارہ، داستانوی طرزِ اظہار اور مؤثر بیانیہ تکنیک کو ہم آہنگ کر کے اردو افسانے میں اپنی ایک منفرد اور پائیدار ادبی راہ متین کی۔

جدید اردو افسانے کے نمایاں تخلیق کاروں میں خالدہ حسین، احمد داؤد، مرزا حامد بیگ، اوراسد محمد خاں کے نام خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے نئے امکانات پیدا کیے بلکہ اسلوب، زبان، بیان اور فنی تکنیک کے حوالے سے بھی ایسے کلیات تجربت کیے جنہوں نے جدید اردو افسانے کو نئی فکری اور جمالیاتی جہش عطا کی۔ ان کے ہل روایتی طرزِ اظہار کی بجائے علامتی، استعاراتی، نفسیاتی اور

تجربیدی انداز بیان نمایاں نظر آتا ہے، جس کے ذریعے انہوں نے اپنے عہد کے پیچیدہ سماجی، سیاسی اور وجودی مسائل کو زیادہ مؤثر اور گہرے انداز میں پیش کیا۔ ان کا جدید افسانہ نگاروں میں خالدہ حسین کا مقام نہایت منفرد اور ممتاز ہے۔ انہوں نے موضوع، اسلوب اور تکنیک تینوں سطحوں پر اردو افسانے کے لیے ایک نئی راہ ہموار کی۔ ان کے افسانوں میں فنی جنت، فکری گہرائی اور علامتی اظہار کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو انہیں اپنے معاصرین سے الگ شناخت عطا کرتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے بھی علامت اور استعارے کو اپنے اظہار کا بنیادی وسیلہ بنایا، لیکن ان کے ہل یہ علامتیں نہ تو مصنوعی محسوس ہوتی ہیں اور نہ ہی ہل ہل دہرائے جاتے کے باعث اپنی تاثیر کھوتی ہیں۔ ان کا ہر استعارہ اور ہر علامت افسانے کے مزاج، کرداروں کی نفسیات اور موضوع کی ضرورت کے

عین مطابق استعمال ہوتی ہے، جس سے ان کے افسانے نازکی، معنوی وسعت اور فکری گہرائی سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانوں کے موضوعات بھی جدید انسان کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے ان تمام مسائل کو موضوع بنایا جو جدید اردو افسانے کے بنیادی مباحث میں شمار ہوتے ہیں، مثلاً وجودی بحران، داخلی تبدیلی، شناخت کا مسئلہ، زندگی کے بے معنویت، روحانی خلا، خوف، بے بسی، محرومی اور انسانی رشتوں کی شکست و ریخت۔ ان کے کردار عموماً ایسے افراد ہوتے ہیں جو زندگی کے مختلف تضادات اور داخلی کشمکش کا شکار ہیں۔ وہ بظاہر ایک معمول کی زندگی گزارتے ہیں لیکن ان کے باطن میں بے یقینی، اضطراب، مایوسی اور شکست کا شدید احساس موجود ہوتا ہے۔ اس

طرح خالدہ حسین نے فرد کی داخلی دنیا اور اس کے نفسیاتی تجربات کو نہایت باریک بینی اور فنی مہارت کے ساتھ افسانوی قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کے افسانوں میں لادھاری، بے بسی اور شکست کا احساس محض ایک انفرادی کیفیت نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں پورے معاشرے کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کارفرما نظر آتی ہے۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات، سیاسی عدم استحکام، جبر، خوف، بے یقینی، سماجی ناہمواری اور انسانی افکار کے زوال نے فرد کی نفسیات پر جو منفی اثرات مرتب کیے۔ خالدہ حسین نے انہیں نہایت گہرے شعور کے ساتھ محسوس کیا اور اپنے افسانوں میں علامتی انداز سے پیش کیا۔ اس لیے ان کی تخلیقات صرف فرد کی کہانی نہیں بلکہ ایک پورے عہد کے اضطراب اور داخلی کرب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خالدہ حسین کی فکر میں روحانی اور صوفیانہ رجحانات بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں تصوف، باطنی معرفت، روحانی جستجو اور انسانی وجود کے باطنی اسرار کی جھلک بھی ملتی ہے۔ تاہم اس فکری تبدیلی کے باوجود انہوں نے اپنے عہد کے تلخ سیاسی اور سماجی حقائق سے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ انہوں نے جبر، خوف، گھٹن، استحصال نظام اور انسانی محرومیوں کو ہمیشہ اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا اور ان مسائل کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے علامتوں، استعاروں، تمثیلوں اور جدید افسانوی تکنیک کے ذریعے نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔

درحقیقت خالدہ حسین کا سب سے بڑا فنی کمال یہی ہے کہ انہوں نے علامت اور استعارے کو اظہار کا ایسا وسیلہ بنایا جو نہ صرف افسانے کی جمالیاتی قدر میں اضافہ کرتا ہے بلکہ قاری تک پیچیدہ اور گہرے انسانی تجربات کو بھی پوری شدت کے ساتھ منتقل کرتا ہے۔ ان کی علامتیں زندگی سے جڑی ہوئی ہیں،

ان کے استعارے حقیقت سے ہم آہنگ ہیں، اور ان کا بیانیہ قاری کو مسلسل غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی بنا پر خالدہ حسین کا شمار جدید اردو افسانے کے ان ممتاز افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے جنہوں نے اسلوب، تکنیک، علامتی اظہار اور فکری وسعت کے ذریعے اردو افسانے کو نئی سمتیں عطا کیں اور اپنے منفرد فن سے جدید افسانے کی روایت کو مزید مستحکم کیا۔

جدید اردو افسانے کے اہم اور منفرد افسانہ نگاروں میں احمد داؤد کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص اسلوب، منفرد علامتی نظام، گہری فکری بصیرت اور نئی افسانوی تکنیک کے ذریعے اردو افسانے میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔ ان کی تحریروں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی

زبان، جملوں کی ساخت، علامتوں کا استعمال، استعاراتی انداز بیان اور بیانیہ تکنیک اپنے معاصر افسانہ نگاروں سے نمایاں طور پر مختلف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانے بظاہر سادہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے پس منظر میں گہرے سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور تہذیبی مضامین پوشیدہ ہوتے ہیں، جو قاری کو مسلسل غور و فکر پر آمادہ کرتے ہیں۔ احمد داؤد کے ابتدائی افسانوں میں جدید اردو افسانے کے معروف افسانہ نگار رشید امجد کے اسلوب کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں علامتی انداز بیان، تجربی فضا، داخلی کیفیت کی عکاسی اور جملوں کی ساخت کسی حد تک رشید امجد کی یاد دلاتی ہے۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ احمد داؤد نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید نکھارا اور رفتہ رفتہ ایک ایسا انفرادی اسلوب تشکیل دیا جو صرف انہی کی شناخت بن گیا۔ یہی انفرادی رنگ بعد کے افسانوں

میں پوری قوت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے، جہاں ان کی زبان، اسلوب، علامتیں اور فکری زاویے دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ احمد داؤد کے افسانوں میں علامت، تشبیہ اور استعارے کا استعمال نہایت وسیع اور بامقصد ہے۔ وہ ان فنی عناصر کو محض ادبی حسن پیدا کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ ان کے ذریعے اپنے عہد کی پیچیدہ سیاسی، سماجی اور انسانی حقیقتوں کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی علامتیں زندگی سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ کئی نہیں پر معنی پیدا کرتی ہیں جس سے ان کے افسانے فکری گہرائی اور معنوی وسعت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر علامت اپنے اندر ایک خاص پیغام اور ایک وسیع سماجی یا سیاسی تناظر رکھتی ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک منفرد خصوصیت مختلف جانوروں اور پرندوں کو علامتی انداز میں پیش کرنا ہے۔ احمد داؤد نے متعدد کہانیوں میں جانوروں، پرندوں اور دیگر جانداروں کو محض کردار کے طور پر نہیں بلکہ انسانی معاشرے، اقتدار، ظلم، خوف، آزادی، جبر اور نفسیاتی کیفیت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہی علامتی نظام ان کے افسانوں کو ایک منفرد فنی شناخت عطا کرتا ہے۔ ان کے افسانے "عجائب گھر نمبر ۲"، "وبسکی اور پرندے کا گوشت"، "اندھے سفر کے گواہ" اور دیگر کئی کہانیاں اس اسلوب کی بہترین مثالیں ہیں، جہاں جانور اور پرندے انسانی کرداروں اور معاشرتی رویوں کے استعارے بن کر سامنے آتے ہیں۔ خصوصی طور پر افسانہ "وبسکی اور پرندے کا گوشت" احمد داؤد کی فنی بصیرت، علامتی اظہار اور سیاسی شعور کا نہایت مؤثر نمونہ ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے براہ راست سیاسی حالات بیان کرنے کے بجائے علامتوں اور استعاروں کے ذریعے مارشل لا کے دور، آمرانہ نظام، جبر، خوف، آزادی، اظہار پر پابندی اور انسانی حقوق کی پامالی جیسے موضوعات کو انتہائی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے کے کردار، واقعات اور علامتیں بظاہر ایک عام کہانی کا حصہ محسوس ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ اس عہد کے سیاسی حالات اور استبدادی نظام کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے بھی یہ افسانہ جدید اردو افسانے کا ایک منفرد نمونہ ہے۔ احمد داؤد نے اس میں علامتی بیانیہ، مختصر مگر معنی خیز جملوں، تہ دار زبان، طنزیہ لہجے اور گہرے استعاراتی اظہار کو اس مہارت سے استعمال کیا ہے کہ افسانہ قاری پر دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔ اس افسانے میں لہجے کی تلخی، طنز کی کٹھن اور احتجاج کی شدت ہر سطر میں محسوس ہوتی ہے۔ ان کا طنز محض مزاح پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ ظلم، استبداد، منافقت، سیاسی جبر اور سماجی ناانصافی کے خلاف ایک مضبوط ادبی احتجاج کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی خصوصیت احمد داؤد کو جدید اردو افسانے کے ان ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل کرتی ہیں جنہوں نے علامت، استعارہ، طنز اور جدید افسانوی تکنیک کے ذریعے اپنے عہد کے تلخ حقائق کو نہایت مؤثر اور پائیدار انداز میں ادب کا حصہ بنایا۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس۔

"وبسکی، پرندوں کا گوشت، نوخیز لڑکیاں ہمارے مجاہدوں کی مرغوب غذا ہے
"۔۔۔"

احمد داؤد کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں علامتوں، استعاروں اور جدید فنی تکنیک کے بھرپور استعمال کے باوجود کہانی پن (Story Element) کبھی کمزور نہیں پڑتا۔ ان کے افسانے محض علامتی یا تجریدی اظہار تک محدود نہیں رہتے بلکہ ابتدا سے اختتام تک ایک مربوط واقعاتی تسلسل اور دلچسپ بیانیہ برقرار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ایک طرف کہانی کے بہاؤ سے وابستہ رہتا ہے اور دوسری طرف علامتوں اور استعاروں کے پ سے منظر میں پوشیدہ فکری اور سماجی معنویت کو بھی دریافت کرتا ہے۔ اس طرح احمد داؤد نے علامتی اسلوب اور قصہ گوئی کے درمیان ایک متوازن رشتہ قائم کیا، جو ان کے فن کی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے روایتی افسانوی اسلوب سے ہٹ کر اظہار کے نئے امکانات تلاش کیے اور جدید افسانوی تکنیک کو اپنایا، لیکن ان کا اسلوب کبھی خشک پیچیدہ یا بے جاں محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شُر میں ادبی لطافت، فنی رنگینی، مؤثر تشبیہوں، بامعنی استعاروں اور دلکش علامتوں کو نہایت مہارت سے استعمال کیا۔ ان کی زبان میں روانی، تازگی اور تخلیقی حسن موجود ہے، جس کے باعث ان کے افسانے فکری اعتبار سے گہرے ہونے کے باوجود ادبی لطف سے بھرپور رہتے ہیں۔ ان کا اسلوب نہ صرف قاری کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے بلکہ اسے مسلسل غور و فکر پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ احمد داؤد کے افسانوی سفر میں وقت کے ساتھ ساتھ نمایاں فکری اور اسلوبیاتی تبدیلی بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں علامتی اظہار، تشبیہات، استعارات اور تجریدی فضا زیادہ نمایاں تھی، لیکن 1980ء کے بعد ان کی تخلیقات میں ایک نئی جہت سامنے آتی ہے۔ اس دور میں انہوں نے محض علامتی تجرید پر انحصار کرنے کے بجائے زندگی کی حقیقی صور سے تعلق، معاشرتی مسائل اور ٹیوس واقعات کو اپنی کہانیوں کا بنیادی حوالہ بنایا۔ ان کے افسانوں میں

حقیقت نگاری، سماجی شعور اور عصری مسائل کی براہ راست عکاسی پہلے کی نسبت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اس تبدیلی کے باوجود انہوں نے علامت اور استعارے کو مکمل طور پر ترک نہیں کیا بلکہ انہیں حقیقت نگاری کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا کہ دونوں عناصر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بعد کے افسانوں میں علامتیں زندگی کی حقیقی صور سے تعلق لیتی ہیں اور واقعات کو مزید گہرائی اور معنویت عطا کرتی ہیں۔ اس طرح احمد داؤد نے جدید افسانے میں فنی تجربے، علامتی اظہار اور حقیقت نگاری کے درمیان ایک متوازن اور مؤثر امتزاج پیدا کیا، جو ان کے منفرد افسانوی اسلوب کی نمایاں شناخت بن گیا۔ مظہر الاسلام نے اپنے عہد کی روایتی افسانوی روایت سے ہٹ کر ایک منفرد ادبی راستہ اختیار کیا اور پختہ اسلوب اور فنی تکنیک میں نئے تجربات کیے۔ ان کے فن کے بارے میں پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں کہ:

"وہ علامتیں اور استعارے کتاب سے نہیں بلکہ زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور زندگی ان کے ہاں شہروں تک محدود نہیں ہے بلکہ لوگ زندگی کے وسعتوں اور تنوعات سے بھی عبارت ہے۔ وہ علامت اور استعارے کو سخن کا پردہ نہیں، آئینہ بناتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک سی علامتوں، استعاروں اور پستوں کو اٹکا دینے والی تکرار نظر نہیں آتی بلکہ اس کے برعکس علامت، استعارے اور بیت کے علاوہ زبان بھی موضوع سے ہی متعین ہوتی ہے" 124

ڈر، خوف، تنہائی اور احساسِ محرومی مظہر الاسلام کے اہم موضوعات ہیں، جن کا اظہار ان کے افسانوں "کسی اور گاؤں کا آدمی"، "محرور کے گھر رات کے کھانے پر" اور "یہ کتاب کس کو دوں" میں نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ "ریت، کنارے اور بارہ ماہ" جیسے افسانوں میں لوگ گیتوں اور دیہی ثقافت کی خوبصورت جھلک بھی نظر آتی ہے۔

مرزا حامد بیگ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں اس لیے منفرد ہیں کہ وہ قاری کو اپنے تجربات اور احساسات کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے "گمشدہ کلمات" کی بیشتر کہانیاں آمریت، مطلق العنان حکمرانی اور اس کے سماجی اثرات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے افسانوی اسلوب کے بارے میں ٹاکٹر نسیم کشمیری لکھتے ہیں کہ: "افسانہ "گمشدہ کلمات" میں فیکا اور اس کی ماں فرسودہ جاگیردارانہ روایت کے امیر ہیں۔ گمشدہ کلمات میں شامل بعض کہانیوں کی ساخت مکمل طور پر علامتی ہے "مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیر" اسی نوع کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں

سرخ لپٹوں والا گلیز، چار مشکی گھوڑوں والی بگھی اور اٹھ بونے کالروں میں اکڑی ہوئی گردن ایسی علامتیں ہیں جو استحصالی طبقہ کی نمائندگی کرتی ہیں جب کہ گلیز سے اترنے والا انسانی پنجر، مظلوم طبقے کی علامت ہے۔^۶

مرزا حامد بیگ کے افسانے "گمشدہ کلمات" کا علامتی کردار فیکا ایک حقیقی انسانی کردار ہے، جو جاگروادانہ جبر اور اس کے پیدا کردہ ماحول کے خلاف مزاحمت کی علامت بنتا ہے۔ ان کا اسلوب تجرباتی معنویت کا حامل ہے، جس میں مختصر جملے، منتخب الفاظ اور خوبصورت استعارے نمایاں ہیں۔ یہی خصوصیات ان کی نثر کو پُرسکون، دلکش اور ماحول کو مؤثر بنانے میں مددگار بناتی ہیں۔

اسد محمد خاں جدید اردو افسانے کے ان اہم افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے انسانی نفسیات، داخلی کشمکش اور معاشرتی حقیقتوں کو نہایت منفرد اور فنی انداز میں اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں انسان کے باطن میں جاری ذہنی انتشار، نفسیاتی الجھنیں، احساس تنہائی، وجودی اضطراب اور زندگی کی پیچیدہ کیفیت نہایت گہرائی کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ وہ صرف فرد کی داخلی دنیا ہی کو پیش نہیں کرتے بلکہ اس کے گرد موجود معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی حالات کو بھی اس کی نفسیاتی کیفیت سے جوڑ کر بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں باطن اور خارج ایک دوسرے کے ساتھ مربوط نظر آتے ہیں اور قاری انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسد محمد خاں کے افسانوں میں زندگی کی تلخ، کرخت اور معروضی حقیقتیں براہ راست بیان نہیں ہوتیں بلکہ انہیں علامتی اور استعاراتی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں علامتیں صرف ایسی حسن پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانی تجربات، معاشرتی تضادات اور نفسیاتی کیفیت کو گہرے معنوں میں اجاگر کرنے کا مؤثر وسیلہ ہیں۔ وہ روزمرہ کے معمولی واقعات، کرداروں اور اشیاء کو اس انداز میں علامتی حیثیت عطا کرتے ہیں کہ وہ اپنے ظاہری مفہوم سے آگے بڑھ کر وسیع تر انسانی اور سماجی معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے افسانوی اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں حالات احتجاج اور مزاحمت کا تقاضا کرتے ہیں، وہاں ان کا لہجہ نہایت تیز، کٹ دار، طنزیہ اور بے باک ہو جاتا ہے۔ وہ طنز کو محض مزاح پیدا کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کے ذریعے معاشرتی ناانصافی، منافقت، جبر، استحصالی رویوں اور انسانی بے حسی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے طنز میں شت بھی ہے، تلخی بھی اور حقیقت کا ایسا احساس بھی جو قاری کو چونکا دیتا ہے اور اسے اپنے عہد کی تلخ حقیقتوں پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ دوسری طرف، ان کے افسانوں میں اسلوبیاتی سطح پر ایک نہایت منفرد فنی تجربہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے، جہاں وہ مجرد تصورات کو مجسم صورت عطا کرتے ہیں اور مجسم حقیقتوں کو مجرد مفہام میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، وہ غیر محسوس احساسات، جذبات اور نفسیاتی کیفیات کو ایسے کرداروں، مناظر اور علامتوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں کہ وہ قاری کے لیے محسوس اور قابلِ مشاہدہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات وہ عام اور مادی اشیاء یا واقعات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی ظاہری حقیقت سے بلند ہو کر فلسفیانہ، نفسیاتی یا وجودی معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی فنی مہارت ان کے افسانوں کو معنوی گہرائی، جمالیاتی حسن اور فکری تفاربت عطا کرتی ہے۔

مجموعی طور پر اسد محمد خاں کا اسلوب علامتی اظہار، نفسیاتی تجزیے، طنزیہ لہجے، استعاراتی پیرایہ بیان اور فنی تجزیوں کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی باطن، سماجی حقیقت، علامتی اظہار اور جدید فنی تکنیک کو اس مہارت سے یکجا کیا ہے کہ ان کی تخلیقات جدید اردو افسانے میں ایک منفرد اور قابلِ قدر مقام کی حامل بن گئی ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جدید افسانہ نگاروں نے موضوع اور اسلوب دونوں سطحوں پر اہم تجربات کیے۔ تاہم محض تکنیکی جدت ہی اب کی کامیابی کی ضمانت نہیں۔ ایک کامیاب افسانہ نگار ہمیشہ موضوع کے مطابق اسلوب اختیار کرتا ہے۔ جدید افسانے کی علامتیں اور استعارے عہد حاضر کے مسائل اور نئے فکری شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آج بھی ساتھ اور ستر کی دہائی کے افسانہ نگاروں کا اسلوبیاتی تنوع اور فنی تجربات نئے افسانہ نگاروں کے لیے اہم اور قابلِ توجہ ہیں۔ علامتی اور استعاراتی اسلوب نے جدید اردو افسانے کو فنی انفرادیت، معنوی گہرائی اور فکری وسعت عطا کی ہے۔ اس اسلوب کے ذریعے افسانہ نگاروں نے نہ صرف اپنے عہد کے پیچیدہ مسائل کو مؤثر انداز میں بیان کیا بلکہ اردو افسانے کو عالمی جدید ادب کے ہم آہنگ بھی بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ علامت اور استعارہ جدید اردو افسانے کی شناخت بن چکے ہیں اور اس کی جمالیاتی و فکری قوت میں نمایاں اضافہ کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. احمد ندیم قاسمی، منشایاد کا افسانہ، مشمولہ ذہن جدید، لاہور، شمارہ نمبر ۶۱، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۹، منشایاد، ہندوستان میں جگہ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۳
۲. منشایاد، ماس اور مٹی، ص ۱۶
۳. احمد داد، ویسکی اور پرندے، علم و عرفان پبلشر لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۹۴
۴. مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا نئی، انڈین ادب لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۲۶۶، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، مرزا حامد بیگ، مشمولہ چہار سو کراچی، والیم ۱۵، ص ۱۸